

عقل کی

برتری

اور تفوق

اسلام میں جب بھی کسی گروہ نے اپنے تصورات و نظریات کو داخل کرنا چاہا تو اس نے سب سے پہلے عقل کی برتری اور اس کی فرمانروائی کا چرچا کیا اور کہا کہ چونکہ مروجہ نظریات و خیالات و افکار ذہن انسانی سے مطابقت نہیں رکھتے اس لئے انہیں رد کر کے اس کی جگہ ایسے افکار و نظریات لانا ضروری ہے جو عقل کے عین مطابق ہوں۔ عقل سے مراد وہ نظریات مراد ہوتے ہیں جو اس دور کے غالب رجحانات کی عکاسی کریں۔ معتزلہ نے بھی یونانی افکار و نظریات کے ذہنی طور پر تسکست کھا کر یہی کچھ کیا۔ اور عقل کی بنا پر زور دیا کہ شریعت میں فیصلہ کن حیثیت رسول کی بجائے عقل کو حاصل ہو اور انہیں وہ سارے اعمال و تصورات شریعت سے خارج کرنے میں آسانی رہے۔ جو ان کے زعم کے مطابق خلاف عقل ہیں۔ چنانچہ معتزلہ نے اپنے مخصوص نظریات عدل اور توحید کی بنا پر پُل صراط، یشاق، اور معراج کا انکار کیا اور ان ساری احادیث کو رد کر دیا جن میں ان کا ثبوت ملتا ہے۔

عقل کی برتری اور تفوق ان کے عقیدہ کا جزو لا ینفک تھا۔ وہ کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے فی نفسہ سے اجتناب کا حکم دیا ہے وہ فی نفسہ بری اور انسان کی نظروں میں پسندیدہ ہیں اس طرح جن چیزوں کے اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ وہ اس لئے ہے کہ وہ چیزیں فی نفسہ اچھی ہیں اور انسانی عقل انہیں پسند کرتی ہے۔

(تجدید مذہب ص ۱۸۰)

اگر ان کلام میں سے شمار ایسی آیات وارد ہوئی ہیں، جن میں عقل کا جائز مقام ان کے لئے اس قدر اہم تھا کہ ان سے انکار کی گئی ہے جو وہ کائنات میں بکھری ہوئی

لا تعداد اللہ کی نشانیوں میں غور و فکر کرے۔ کبھی انسان کی توجہ ہواؤں کی تعریف و تحریف کی طرف مبذول کرائی گئی ہے۔ تو کبھی سورج، چاند اور ستاروں کی حرکات اور دن رات اور موسم کی تبدیلی کی طرف، کبھی نباتات کی روئیدگی اور اس کی مختلف منازلِ حیات کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور کہیں حیوانات کی تخلیق اور ان سے حاصل ہونے والے فوائد کی طرف، کبھی عالمِ آفاق میں قدرتِ الہی پر واضح شواہد کی طرف توجہ کی دعوت دی گئی ہے۔ تو کبھی انسان کے اپنے اندر کی دنیا کی طرف - غرض یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ قرآنِ کریم کا ایک متعدد و بے حد ایسی آیات پر مشتمل ہے جن میں انسان کو اپنے اندر اور باہر کی دنیا میں سوچنے، غور و فکر کرنے کی دعوت دی گئی ہے کہ کس طرح نباتات کا پتہ پتہ، پھولوں کی ہر نیچھڑی، شجر و جرجر اور شمس و قمر شہادت دے رہے ہیں کہ وہ قدرت کے مختلف اسرار کا مجموعہ اور خالقِ کائنات کے علم و حکمت کے واضح شواہد ہیں۔ اس غور و فکر سے انسان کو دو طرح کے فوائد حاصل ہوتے ہیں:-

۱۔ پہلا یہ کہ انسان ان کئی خواص و تاثیرات معلوم کر کے ان سے مستمتع ہو سکتا اور ان سے اپنے کام لے سکتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے خود ہی فرمادیا کہ:

سَخَّرَ لَكُم مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَّا فِی الْاَرْضِ (۱۳۱) جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب تمہارے قابو میں کر دیا ہے۔

یعنی کائنات کی ہر چیز کو انسان کا تابع فرمان بنا دیا گیا۔ اب اسے کام میں لانا انسان کا اپنا کام ہے۔ اور فائدہ غور و فکر اور عقل کو کام میں لانے سے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔

۲۔ جب انسان ایسے کائنات کا تحقیق و تدقیق سے مطالعہ کرتا ہے اور ان میں غور و فکر کران کے پوشیدہ اسرار و رموز اور حکمتوں سے آگاہی حاصل کرتا ہے۔ تو یہ باتیں اسے خود خالقِ کائنات کے وجود اس کے محیر العقول علم و حکمت کی طرف واضح نشاندہی کرتی ہیں۔ اور بے اختیار اس کے منہ سے یہ الفاظ نکلتے ہیں:-

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا (۱۳۲) اے پروردگار! تو نے اس کائنات کو

عبث نہیں پیدا کیا۔

عقل اور ہدایت | آیاتِ الہی سے مندرجہ بالا نتائج ماخوذ کرنے کی تائید میں ہم

مشرقی کو اس دوران پیش آیا۔ جب وہ انگلستان میں زیر تعلیم تھے۔

۱۹۰۹ء کا ذکر ہے اتوار کا دن تھا اور روز کی بارشیں ہو رہی تھیں۔ میں کسی

کام سے باہر نکلا۔ تو جامع چرچ کے مشہور ماہر فلکیات پروفیسر جمیس جینز

بدل میں انجیل دہائے چرچ کی طرف جا رہے تھے۔ میں نے قریب ہو کر

سلام کیا۔ تو وہ متوجہ ہوئے اور کہنے لگے ”کیا چاہتے ہو؟“ میں نے کہا ”دو باتیں“

پہلی یہ کہ زور سے بارشیں ہو رہی ہیں اور آپ نے چھاتہ بغل میں داب رکھا ہے۔ سر

جمیس جینز اس بدحواسی پر مسکرائے اور چھاتہ تان لیا۔ دوم یہ کہ آپ جیسا شہرہ آفاق آدمی گرجا

میں عبادت کے لئے جا رہا ہے؟ میرے اس سوال پر پروفیسر جمیس لہجہ بھر کے لئے رک

گئے اور میری طرف متوجہ ہو کر فرمایا:

”آج شام میرے ساتھ چائے پیو۔“

چنانچہ میں شام کو ان کی رہائش گاہ پر پہنچا۔ ٹھیک چار بجے لیڈی جمینز باہر

آکر کھنے لگیں ”جمینز تمہارے منتظر ہیں“ اندر گیا تو ایک چھوٹی سی میز پر چائے لگی

ہوئی تھی۔ پروفیسر صاحب تصورات میں کھوئے ہوئے تھے۔ کہنے لگے: تمہارا سوال

کیا تھا؟ اور میرے جواب کا انتظار کئے بغیر، اجرام سماوی کی تخلیق، اس کے حیرت

انگیز نظام، بے انتہا پنہائیوں اور فاصلوں، ان کی پیچیدہ راہوں اور مداروں، نیز

باسمعی وابط اور طوفان ہائے نور پر ایمان افروز تفصیلات پیش کیں۔ کہ میرا دل اللہ کی

اس کبریائی و جبروت پر دہلنے لگا اور ان کی اپنی یہ کیفیت تھی کہ سر کے بال بیدھے

اٹھے ہوئے تھے۔ آنکھوں سے حیرت و خشیت کی موگوں کیفیتیں عیاں تھیں۔ اللہ کی

حکمت و دانش کی ہمیت سے ان کے ہاتھ قدرے کانپ رہے تھے۔ اور آواز

لرز رہی تھی۔ فرمانے لگے ”غایت اللہ خان!“ جب میں خدا کی تخلیق کا تاناموں پر

نظر ڈالتا ہوں تو میری تمام ہستی اللہ کے جلال سے لرزنے لگتی ہے اور جب میں

کلیسا میں خدا کے سامنے سرنگوں ہو کر کہتا ہوں ”تو بہت بڑا ہے“ تو میری ہستی کا ہر

ذره میرا ہتھوڑا بن جاتا ہے مجھے بے حد سکون اور خوشی نصیب ہوتی ہے۔ مجھے دو ٹونوں

کی نسبت عبادت میں ہزار گنا زیادہ کیف ملتا ہے۔ کہو غایت اللہ خاں! تمہاری سمجھ

علامہ مشرقی کہتے ہیں کہ پروفیسر جیمز کی اس تقریر نے میرے دماغ میں عجیب کھرام پیدا کر دیا۔ میں نے کہا۔ ”جناب والا! میں آپ کی روح پر دو تفصیلات سے بے حد متاثر ہوا ہوں اس سلسلہ میں قرآن مجید کی ایک آیت یاد آگئی ہے۔ اگر اجازت ہو تو پیش کروں؟“ فرمایا: ضرور! چنانچہ میں نے یہ آیت پڑھی۔

ومن الجبال جدوجہ وحممر
مختلف ألوانها وغرائب سود ومن
الناس واللہ واب لا لنعلم مختلف
ابوانہ صكذالک انما یخشی
اللہ من عبادہ العلموا (۳۵/۲۸-۲۹)
اور پہاڑوں میں سفید اور سرخ رنگوں کے قطعات
ہیں اور بعض کا لے سیاہ ہیں۔ انسانوں، جانوروں
اور چارپایوں کے بھی کئی طرح کے رنگ ہیں۔
خدا سے ناس کے بندوں میں سے وہی ڈرتے ہیں
جو صاحب علم ہیں۔

یہ آیت سنتے ہی پروفیسر جیمز بولے:-

”کیا کہا؟ اللہ سے صرف اہل علم ڈرتے ہیں، حیرت انگیز، بہت عجیب۔ یہ بات جو مجھے
پچاس برس کے مسلسل مطالعہ سے معلوم ہوئی۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کس نے بتائی کہ کیا قرآن
میں واقعی یہ بات موجود ہے؟ اگر ہے تو میری شہادت کچھ لو کہ قرآن ایک الہامی کتاب ہے۔
محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ان پڑھ تھے۔ انہیں یہ حقیقت خود بخود نہ معلوم ہو سکتی تھی۔ یقیناً اللہ
تعالیٰ نے انہیں بتائی تھی۔ بہت خوب۔ بہت عجیب!“ (علم جدید کا چیلنج مولفہ وحید الدین
خان حسن ۲۱۵ تا ۲۱۷)

یہ ہیں وہ نتائج جو اشیائے کائنات میں غور و خوض کرنے کے بعد ہی حاصل ہو سکتے ہیں
اور جن کی طرف قرآن نے ہر شخص کو دعوت دی ہے۔ اب اس کے برعکس ایک دوسرا واقعہ
بھی ملاحظہ فرمائیے۔

سرپلس ڈارون (۱۸۰۸-۱۸۸۲ء) اور

عقل اور ضلالت

پہلا مغربی مفکر ہے جس نے انسان کی تخلیق کے مسئلہ
میں نظریہ دارالتقا کو باضابطہ طور پر پیش کیا وہ کہتا ہے کہ آج کے ۲۳ سال پیشتر سمندر کے
ساحل کے قریب پایا ب پانی کی سطح پر کائی نمودار ہوئی۔ پھر اس کائی کے کسی ذرہ میں ”کسی نہ
کسی طرح“ حرکت پیدا ہوئی تھی۔ یہی اس دنیا میں زندگی کی پہلی نمود تھی۔ اسی حیات سے

بد میں نباتات اور اس کی مختلف شکلیں وجود میں آئیں۔ پھر حیوانات وجود میں آئے اور بالآخر بندر کی نسل سے انسان پیدا ہوا ہے۔

دارون کی تحقیق و تدقیق اپنے مقام پر بجا اور درست۔ یہ صحیح ہے یا غلط یہ ہم کسی اور مقام پر زیر بحث لائیں گے۔ واقعہ یہ ہے کہ دارون پر اس تحقیق و تدقیق کا یہ اثر ہوا کہ وہ بالآخر خدا کا منکر ہو کر مرا تھا۔ ابتداءً وہ "لا ادریت" کی طرف مائل تھا اسی وجہ سے اس نے یوں کہا تھا کہ اس کاٹی میں "کسی نہ کسی طرح" زندگی پیدا ہو گئی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ اس وقت خدا کی ہستی کے بارے میں شکوک و شبہات کا شکار تھا ان ہر دو اوقات سے ہم ان نتائج تک پہنچتے ہیں کہ:-

(۱) اگر عقل وحی کے تابع ہو کر چلے تو یہ خالق کائنات پر بے پناہ ایمان و یقین کا سبب بنتی ہے۔

(۲) اگر عقل وحی سے بے نیاز ہو کر چلے تو بسا اوقات ضلالت و گمراہی کی انتہائی پہنائیوں میں جا گرتی ہے۔

یہیں سے عقل اور وحی کے مقامات کا تعین ہو جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کی عقل انتہائی محدود ہے۔ اور یہ کائنات لامحدود ہے۔ پھر اس کائنات کی ایک ایک چیز کی حقیقت کے ادراک سے عقل قاصر ہے۔ عقل کی مثال آنکھ کی طرح ہے۔ اور وحی وہ خارجی روشنی ہے جس کی موجودگی میں عقل صیغہ راستہ پر چل سکتی ہے۔ وحی خالق کائنات ہی علم و حکمت کا دوسرا نام ہے۔ اور یہ تو ظاہر ہے کہ ایشیائے کائنات کی حقیقت کا علم خالق کائنات سے اور زیادہ کون جان سکتا ہے۔ لہذا جو عقل وحی کی روشنی سے بے نیاز ہو کر اپنا راستہ تلاش کرے گی وہ ہمیشہ تاریکیوں میں ہی جھٹکتی رہے گی اور یہی کچھ ابتدائے آفرینش سے لے کر آج تک عقل اور اہل عقل کے ساتھ ہوتا رہا ہے۔ اور آئندہ بھی یہی کچھ ہوتا رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں اس عقل کو جو وحی کی روشنی سے فائدہ نہیں اٹھاتی۔ حیوانی سطح کی عقل سے بھی فروتر قرار دیا گیا ہے۔ ارشاد باری ہے۔

ان شر الہد اب عند اللہ الصیم
البحر الہد اب لا یعلمون (۳۳)
یقیناً اللہ کے نزدیک سب سے بڑے حیوانی وہ
(انسان) ہیں جو کچھ سمجھتے ہی نہیں۔

دوسرے مقام پر فرمایا۔

ولقد نذرنا الجنه كذبا من
الجن والانس هم قلوب لا يفقهون
بها ولهم اعين لا يبصرون بها ولهم
اذان لا يسمعون بها اولئك
كالاعام بل هم اضل اولئك
هم الغفلون (۱۹)

اور ہم نے بہت سے جن اور انسان کو دوزخ کے
لئے پیدا کئے ہیں۔ ان کے دل ہیں لیکن ان سے سمجھتے
نہیں اور ان کی آنکھیں ہیں مگر ان سے دیکھتے نہیں۔
اور ان کے کان ہیں پر ان سے سنتے نہیں۔ یہ لوگ
چارپایوں کی طرح ہیں۔ بلکہ ان سے بھی بھٹکے ہوئے
یہی لوگ ہیں جو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔

گویا اس آیت کا ابتدائی حصہ تبارہا ہے۔ کہ اس کے مخاطب وہ لوگ ہیں جو وحی
الہی پر ایمان نہیں لاتے ان کی عقل محض حیوانی سطح پر ہے۔ بلکہ اس سے بھی کم تر۔ کیونکہ وہ
عقل و شعور رکھنے کے باوجود وحی کی روشنی سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔

بلاشبہ دین کے انتخاب کے بارے میں عقل کو
عقل کا دائرہ کار

تحقیق کرے۔ پھر چاہے تو اسے قبول کرے اور چاہے تو رد کر دے۔ کیونکہ دین کے اختیار
کرنے میں کوئی مجبوری نہیں۔ لیکن دین کو قبول کرنے کے بعد عقل کو ہرگز یہ حق نہیں دیا گیا کہ
وہ اس کے اہم اور بنیادی عقائد و نظریات پر ہی ہاتھ صاف کرنا شروع کر دے۔ بلکہ اسے اب
وحی کے تابع ہو کر چلنا چاہیے اور یہ اتباع اندھی عقیدت کے طور پر نہیں بلکہ علی و ہر البصیرت
ہونا چاہیے۔ لہذا ہمارے خیال میں عقل کے کام مندرجہ ذیل قسم کے ہونے چاہئیں۔

(۱) وحی کے بیان کردہ اصول و احکام کے اسرار اور حکمتوں کی توضیح و تشریح۔

(۲) احکام کے نفاذ کے عملی طریقوں پر زمانہ کے حالات کے مطابق غور کرنا اور پیش

آمد رکاوٹوں کو دور کرنا۔ مثلاً وحی نے اگر سود کو حرام کر دیا ہے تو عقل کا کام

یہ ہونا چاہیے کہ وحی کی حدود کے اندر اس کو ختم کرنے کے لئے محل پیش کرے۔

پھر اگر عقل سود یا اس کی بعض شکلوں کو حرام سمجھنے کے بجائے اس کو "حلال"

بنانے کے چیلے سوچنے لگے۔ تو عقل کے استعمال کا یہ رُخ قطعاً صحیح قرار نہیں

دیا جاسکتا۔

(۳) مادی نظریات کے مقابلہ میں وحی کے نظریات کی برتری ثابت کرنا۔ اور ان کو مدلل

طور پر پیش کرنا۔ اور اگر مادی نظریات سے عقل خود مرعوب ہو کر وحی میں کانٹ چٹا
اور اس کی دور انداز تاویلات کر کے اسے غیر ذہنی نظریات کے مطابق بنانے
کی کوشش کرے گی تو اس کا یہ کام دین میں تحریف شمار کیا جائے گا۔
(۴) تحریف شدہ ادیان پر اسلام کی بردلائل بہتری اور فوقیت ثابت کرنا اور بیرونی
حملوں کا دفاع کرنا۔

(۵) انفس و آفاق کی وہ آیات جن میں غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے۔ ان میں تحقیق و
تفتیش کر کے انہیں آگے بڑھانا اور ان سے مطلوبہ فوائد حاصل کرنا۔ جن کی پہلے
وضاحت کی جا چکی ہے۔

یہ اور اس جیسے کئی دوسرے کام ہیں۔ جن میں عقل سے کام لیا جاسکتا ہے۔ اسی لئے
تو اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبرؐ سے فرمایا کہ اعلان کر دیجئے کہ:

قل ھذہ سبیلی ادعوا الی اللہ کہہ دیجئے کہ میرا رستہ تو یہ ہے۔ کہ میں اور میرے
علی بصیرۃ اناد من استغی و پیروکار خدا کی طرف سمجھ بوجھ کی بنیاد پر دعوت
سبھن اللہ وما انا من المشرکین (طلب) دیتے ہیں۔ اور میں مشرکین سے نہیں ہوں۔

پھر وہ لوگ ذہنی طور پر جدید سائنس
عقل کی ناجائز مداخلت

لئے کہ وحی اس کے ہمنوا نہیں ہوتی۔ تو وہ وحی سے ہی انکار کر بیٹھتے ہیں۔ ان کے
متعلق فرمایا۔

بل کذبوا بیانا معیطوا بعلمہ و بلکہ جس چیز کے علم پر یہ تالو نہ پاسکے اس کو جھٹلا
لنمایا تھم تاویلہ کذلک کذب دیا۔ حالانکہ ابھی اس کی حقیقت ان پر کھلی ہی نہیں
الذین من قبلہم (۱۰۴) اسی طرح ان سے پہلے لوگ بھی جھٹلاتے رہے۔

جبکہ حقیقت یہ ہے کہ سائنس کے نظریات ہر دور میں بدلے رہتے ہیں۔ ایک دور
میں ایک نظریہ قبول عام کا شرف حاصل کرتا ہے۔ تو تھوڑی ہی مدت کے بعد اس کی تردید
شروع ہو جاتی ہے۔ پھر ایک تیسرا نظریہ سامنے آتا ہے۔ پھر کبھی سب سے پہلے نظریہ کی
تردید ہو جاتی ہے تو وحی آخر کون سے نظریہ کا ساتھ دے؟ اور کیا باقی ادوار میں اس
کو جھٹلا دیا جائے گا؟ اس بارے میں قرآن مجید کا جواب ہے۔

ساتویں صدی قبل مسیح تک یہ سمجھا جاتا تھا کہ زمین ساکن ہے اور سورج اس کے گرد حرکت کر رہا ہے۔ یونان کے ایک مفکر فیثاغورث (۵۹۰ ق م) نے یہ نظریہ پیش کیا کہ زمین ساکن نہیں بلکہ مڑک رہے جو سورج کے گرد چکر کاٹ رہی ہے اور سورج اپنی جگہ پر ساکن (ثابت ہے) فیثاغورث کا یہ نظریہ یونان میں اتنا مقبول ہوا کہ اس کی باقاعدہ درس و تدریس شروع ہو گئی۔ بعد ازاں چوتھی صدی ق م میں یونان ہی کے ایک دوسرے مفکر پطلمیس نے اس نظریہ کی تردید کی۔ پطلمیس علم ہندسہ، ہیئت اور نجوم میں یکتاے روزگار تھا اور اس نے اجرام فلکی کی تحقیقات کے لئے ایک رصد بھی تیار کی تھی۔ پطلمیس کے نظریہ کے مطابق مزید کو ساکن اور مرکز چار کرتے، سات آسمان اور ان پر سات سیارے، اٹھواں ملک توایت، آسمان کے بارہ برج یہ سب اسی نظریہ کے اجزاء ہیں۔ پطلمیس کے پیش رو ارسطو اور برنخس بھی اسی نظریہ کے قائل تھے۔ پطلمیس کا نظریہ چاروں رنگ عالم میں بہت مشہور ہوا، مصر، یونان، ہند اور یورپ میں پندرہویں صدی عیسوی تک اسی نظریہ کی تعلیم دی جاتی رہی اور ۱۸۰۰ سو سال تک یہ نظریہ دنیا بھر میں مقبول رہا۔ جب قرآن نازل ہوا تو اس وقت یہی نظریہ درست سمجھا جاتا تھا۔ بعد ازاں (۱۹۰۳-۱۵۴۳) نے سولہویں صدی عیسوی میں زمین کی محوری گردش کا بھی اور سورج کے گرد سالانہ گردش کا بھی تصور پیش کیا بعد ازاں ایک اور ہیئت دان ٹیکوبراہی نے کوپرنیکس کے نظریہ کو رد کر دیا اور تھوڑی سی ترمیم کے بعد اس سے پہلے نظریہ پطلمیس کو صحیح قرار دیا۔ بعد ازاں اٹلی کے ایک مفکر گیلیلیو (۱۵۶۴-۱۶۴۲) نے زمین کو مرکز تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور کوپرنیکس کے نظریہ کی حمایت کی۔ چنانچہ پادریوں نے اسے مذہب کے خلاف مسائل قرار دے کر اسے مجرم گردانا چنانچہ وہ جیل میں ڈال دیا گیا۔ اور ایک سال بعد رہائی ہوئی۔ بعد ازاں سر آئزک نیوٹن (۱۶۴۲-۱۷۲۷) کے کوپرنیکس کے نظریہ کو اور تحقیقات پر پہنچایا۔ چنانچہ آج دنیا بھر میں یہی نظریہ صحیح تسلیم کیا جاتا ہے۔ جو فیثاغورث کے نظریہ کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ فیثاغورث نے جہاں یہ نظریہ پیش کیا تھا کہ سورج ساکن (ثابت سیارہ) ہے اور ہماری زمین اور کئی دوسرے سیارے اس کے گرد چکر کاٹ رہے تھے۔ وہاں اس نے یہ نظریہ بھی پیش کیا تھا کہ اس وسیع کائنات میں سورج کی طرح ایک اور بھی کئی سیارے موجود ہیں۔ اور یہ عین ممکن ہے کہ یہ ثابت سیارے بھی اپنے خاندان سمیت کسی بہت بڑے

ثابت سیارے (ثابت الثوابت یا شمس اشمس) کے گرد چکر کاٹ رہے ہوں۔ چنانچہ موجودہ دور کے ہیئت دانوں سے بھی اسی قسم کی صدائے بارگشت سنائی دے رہی ہے۔

اب دیکھیے قرآن کریم میں ہے۔

اور سورج اپنے مقرر راستے پر چلتا رہتا ہے (فتح محمد جالندھری)
والشمس تجري مستقرها ۳۶/۳۸ } اور سورج اپنے ٹھکانے کی طرف بڑھ رہا ہے (تفسیر القرآن)

ابذا جدید نظریات صرف اسی صورت میں قابل قبول سمجھے جائیں گے جبکہ وہ وحی سے مطابقت رکھتے ہوں۔ بصورت دیگر ان نظریات کا یا تو بہ دلائل بطلان کرنا چاہیئے۔ اور اگر یہ نہ ہو سکے تو کم از کم اس وقت کا انتظار کرنا چاہیئے جبکہ یہ نظریہ وحی کے مطابق ہو جائے اور بالآخر یہ نظریہ سائنٹیفک تحقیقات کے بعد وحی کے مطابق ہونا لازم ہے۔ کیونکہ وحی ایک حقیقت ہے، اور نظریات انسان کی محدود عقل کا کمرشہ۔

بعض لوگ انہی جدید نظریات سے مرعوب
اپنے دور کی علمی سطح

کے بزرگ خود قرآن کریم اپنے علمی دور کی سطح کے مطابق لانے کی کوشش میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ ہمارے خیال میں یہ کوئی دینی خدمت نہیں ہوتی۔ بلکہ اس سے الہام اور ذہنی انتشار کی راہیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اب اگر ہر دور کے مفکر قرآن کو ہر دور میں علمی سطح کے مطابق لاکر نئی نئی تعبیریں پیش کرنے لگ جائیں تو کیا قرآن کے معانی و مطالب کا جو حشر ہو سکتا ہے وہ معلوم ہے؟

معتزلین کسی سائنسی نظریہ سے نہیں بلکہ یونانی فلسفہ سے شدید متاثر تھے ایک انگریز مصنف ان کے متعلق لکھتا ہے:-

”معتزلہ کی عقلیت کا اسلام کے نظام فکر میں جذب ہونا دشوار تھا۔

اگر اعتزال کی تحریک کامیاب ہو جاتی تو اسلامی ثقافت انتشار اور برہمی کا

شکار ہو جاتی۔ اور اسلام کو اس سے ناقابل تلافی نقصان پہنچتا۔ ان

کی علمی کاوشوں نے راسخ العقیدہ مسلمانوں کو بھی کسی حد تک اپنا ہمنوا بنا

لیا تھا لیکن جب معتزلہ کی انتہا پسند جماعتوں نے اسلامی عقائد کو یونانی تصورات

کے ساتھ ملا کر دینی عقائد کو یونانی

فلسفہ سے اخذ کرنا شروع کئے تو آخر الذکر طبقہ نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔
(ماخوذ از ایچ۔ اے۔ آد۔ گب)

مختزلہ کے زوال کے اسباب

ہم دیکھ چکے ہیں کہ اعتراض کا فتنہ محض دولت عباسیہ کی پشت پناہی کے سہارے تقریباً سو سو سال تک زندہ رہا۔ ورنہ امت کا اجتماعی ضمیر دین کے سادہ اصولوں کے مقابلہ میں ایسے فلسفیانہ عقائد کو گوارا کرنے کے لئے کسی وقت پر تیار نہ ہوتا۔ تاہم بنظر غائر دیکھا جائے تو اس فرقہ کے زوال کے درج ذیل اسباب نظر آتے ہیں۔

(۱) محدثین کرام کا زبردست تحقیقی کام۔ جس نے مسلمانوں کے تمام سوچنے والے لوگوں کو مطمئن کر دیا۔ کہ رسول اللہ کی سنت جن روایات سے ثابت ہے وہ ہرگز مشتبہ نہیں بلکہ نہایت معتبر ذرائع سے امت کو پہنچی ہیں۔ اور ان کو مشتبہ روایات سے الگ کرنے کے بہترین علمی ذرائع موجود ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ جسم و اعتراض اور خوارج کے فتنوں وضعی روایات کی کثرت اور انکار حدیث کے عام میلان نے ہی علمائے دین کو احادیث کی تحقیق اور چھان بھٹک، راویوں پر حرج و تعدیل کے فن کو جو دین لانے کی ضرورت کا شدید احساس دلایا۔ بمصداق

عد دسترے برا نگویو کہ ما درال باشد

فن رجال کے امام اور معتبر مؤرخین نے اسی تیسری صدی ہجری میں اپنے اپنے کاروائے کا یا سرانجام دیئے جن کی بناء پر امت نے وضعی روایات اور غیر اسلامی نظریات کو علی وجہ البصیرت رد کر دیا۔

(۲) علمائے دین نے قرآن کی ہی تصریحات سے یہ ثابت کر دیا کہ رسول اکرم کی حیثیت محض ایک "نامہ برد" کی نہیں تھی جیسا کہ یہ لوگ ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ بلکہ آپ کو خدا نے معلم بنا، مفسر قرآن، شارع قانون، قاضی اور حاکم بھی مقرر کیا تھا۔ لہذا جو شخص آپ کی پیروی سے آزاد ہو کر قرآن کی پیروی کا دعویٰ کرتا ہے وہ فی الحقیقت قرآن کا پیروکار نہیں ہو سکتا۔ ان لوگوں کی ذہنی تاویلات بھی کھل کر لوگوں کے سامنے آ

چکی تھیں۔ جو ایک دوسرے سے یکسر مختلف اور متضاد تھیں۔ لوگوں نے دیکھ لیا تھا کہ اگر قرآن سے سنت کا تعلق ختم کر دیا جائے تو دین کا حلیہ کس بڑی طرح سے بگڑ جاتا ہے۔

(۳) امت کا اجتماعی ضمیر یہ تصور بھی اپنے ذہن میں نہ لاسکتا تھا کہ مسلمان رسول کی پیروی سے آزاد بھی ہو سکتا ہے۔ جو آج تک متواتر امت مسلمہ میں چلی آ رہی تھی چند سرچرک انسان تو ہر زمانہ اور ہر قوم میں ایسے نکل سکتے ہیں جو ایسی باتوں میں ہمنوا بن جائیں لیکن پوری امت کا سر پھرا ہو جانا مشکل ہے۔ چنانچہ امت مسلمہ اس بات پر قطعاً آمادہ نہ ہو سکی کہ زندگی کا ایک نیا نظام ایسے لوگوں کے ماتھوں بنوایا جائے جو دینا کے مادی فلسفہ اور تخیل سے متاثر ہو کر اسلام کا ایک جدید ایڈیشن پیش کرنا چاہتے تھے۔

(۴) اعتزال کی تحریک کو حکومت عباسیہ کی حمایت حاصل تھی۔ لیکن امت کے اجتماعی متاثر سے خلیفہ والفق باللہ خود بھی متاثر ہو چکا تھا رہی سہی کسر اس مناظرہ نے نکال دی جس نے اس کے ذہن کی کاپاپلٹ کر رکھ دی۔ بعد میں جب خلیفہ متوکل علی اللہ نے اعتزال کی جانب سے یکسر منہ موڑ لیا تو یہ تحریک اپنی موت آپ مر گئی۔

نتائج

جسم و اعتزال کی تحریک کے مطالعہ کے بعد مندرجہ ذیل نتائج واضح طور پر سامنے آتے ہیں۔

(۱) جب کبھی اسلام میں نئے نظریات کو داخل کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے تو وہ بالعموم اس دور کے غالب رجحانات سے ذہن شکست خوردگی کا نتیجہ ہوتا ہے خواہ یہ نظریات فلسفہ سے تعلق رکھتے ہوں یا سائنس سے۔

(۲) ان نظریات کو تسلیم کرانے کے لئے عقل کی برتری اور تفوق کا ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے۔ عقل کی برتری و تفوق جسم و اعتزال دونوں کے عقیدہ کا جزو تھا۔

(۳) ان نظریات کی پہلی احادیث اور بالخصوص جبر و احد برتری ہے۔ جن میں طرح طرح

کے شکوک و شبہات پیدا کر کے انہیں فانی اور ناقابل قرار دیا جاتا ہے۔ کیونکہ یہی احادیث نئے نظریات کو اسلامی عقائد میں داخل کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہوتی ہیں۔ امام ابن تیمیہ ان لوگوں کے متعلق لکھتے ہیں کہ ۱۔

یہ لوگ انحضرتؐ کی احادیث کو اس لئے نہیں مانتے کہ وہ احاد ہیں اور ان سے علم حاصل نہیں ہوتا اور ذہنی خیالات اور باطل شبہات کو قبول کر لیتے ہیں۔ جو معتزلہ جہمیہ اور فلاسفہ سے منقول ہیں۔ اور ان کا نام براہن عقلیہ رکھ لیتے ہیں۔ (صواعق جلد ۲۔ ص ۲۷۵ بحوالہ جماعت اسلامی کا نظریہ حدیث ص ۲۱۹) اس لئے معتزلہ قانون اسلامی کے مآخذ میں سے حدیث اور اجماع کو قریب قریب ساقط کر دیتے ہیں۔ (الفرق بین الیقین ص ۱۲۷ بحوالہ خلافت و ملکیت ص ۲۱۹) پھر جسم و اعتزال چونکہ مسئلہ تقدیر میں متضاد خیالات رکھتے ہیں۔ لہذا جو احادیث جہم کے نزدیک مردود تھیں وہی اعتزال کے نزدیک صحیح ترین تھیں۔ اسی طرح جو احادیث معتزلہ کے ہاں ناقابل قبول تھیں وہی جہمیہ کے ہاں قبول تھیں۔ اور دونوں عقلی دلائل سے ان احادیث کو رد و قبول کا شرف بخشتے تھے۔

(۴) حدیث کی حجیت سے انکار کے بعد قرآن کی من مانی تاویلات کی گنجائش نکل آتی ہے لیکن یہاں بھی متضاد صورت کے باعث یہی صورت حال تھی۔

(۵) حدیث کی حجیت سے انکار اور قرآن کی تاویل لازم و ملزوم ہوتی ہے۔ جو شخص حدیث سے انکار کرے گا وہ لازمی طور پر قرآن کی کوئی نئی توجہ پیش کرے گا۔